ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی کا انقلاب (۳)

خدا کو پانا اپنے آپ کو پانا ہے

انسان کا خدا کی جستجو کرنا درحقیقت اپنی ہی جستجو کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں خدا کو تلاش کرنا یا اپنی خودی کو تلاش کرنا، خدا کی خودی میں گم ہونا یا اپنی خودی میں گم ہونا، خدا کی خودی کو گم کرنا یا اپنی خودی کو گم کرنا، خدا کی خودی میں ڈوبنا یا اپنی خودی میں ڈوبنا، خدا کی نمود ہونا یا انسان کی نمود ہونا، خدا کا انسان کو بے حجاب کرنا یا انسان کا خدا کو بے حجاب کرنا، خدا کو فاش دیکھنا یا خودی کو فاش دیکھنا، خدا کو دیکھنا یا اپنے آپ کو دیکھنا، خدا سے خودی کو طلب کرنا یا خودی سے خدا کو طلب کرنا، خدا کے ساتھ خلوت گزین ہونا یا اپنے آپ کے ساتھ خلوت گزیں ہونا، خدا کے نور سے اپنے آپ کو منوّر کرنا یا اپنے نور سے اپنے آپ کو منوّر کرنا، خدا کی طرف گامزن ہونا یا اپنی طرف گامزن ہونا، خدا سے پیوستہ ہونا یا اپنے آپ سے پیوستہ ہونا، ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف پیرائے اور ایک ہی عمل کی مختلف تعبیرات ہیں۔

نمود تیری نمود اس کی، نمود اس کی نمود تیری
خدا کو تو بے حجاب کر دے، خدا تجھے بے حجاب کر دے

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب، ہم ز خودی خدا طلب

محکم از حق شو سوئے خود گام زن
لات و عزّیٰ ہوس را سر شکن

چناں باذاتِ حق خلوت گزینی
کہ او بیند ترا، او را تو بینی

تو ہم بذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق
بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند

© rasailojaraid.com

اگرچہ خدا ہونے کا احساس خودی کا ایک عارضی تجربہ ہوتا ہے تاہم وہ ان معنوں میں عارضی نہیں ہوتا کہ اس تجربہ کے منقطع ہونے اور اپنی معمولی حالت کی طرف عود کرنے کے بعد خودی کا یہ تغیر صاف طور پر نظر آتا ہے کہ خودی اس تجربہ کی وجہ سے مستقل طور پر خدا کی صفات کے رنگ سے رنگین اور خدا کے اخلاق سے متخلّق ہوگئی ہے اور خدا کی دنیا کو بھی اس طرح سے بدلنا چاہتی ہے جس طرح سے خدا خود اسے بدلنا چاہتا ہے۔ گویا مستقل طور پر خدا کی معاون بن گئی ہے۔ اہلِ مغرب سے تو یہ توقع ہی نہیں کہ وہ فطرتِ انسانی کے اسرار و رموز کو خود بخود سمجھ سکیں گے، لیکن مشرق میں بھی اس حقیقت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے کہ ہر انسان کی خودی وہ مقام حاصل کر سکتی ہے جو ایک وقت میں منصور حلاج نے پایا تھا اور جسے پانے کے بعد اس نے 'انا الحق' کہا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر انسان کی خودی اپنی قدرتی نشوونما کے نتیجہ کے طور پر بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں وہ خدا ہونے کا احساس کرتی ہے اور اس کے بعد وہ خدا کی دنیا کو بھی اسی طرح سے بدلنا چاہتی ہے جس طرح خدا اسے بدلنا چاہتا ہے۔ اگر اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا جاتا تو آج یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی کہ بعض لوگ تو خدا سے بیزار ہیں اور بعض لوگ جو خدا کے عرفان کے مدّعی ہیں اپنی خودی کی نفی کرتے ہیں اور اپنے عرفان کو اپنی خودی کے استحکام اور اثبات کے لیے خدا کی نیابت کا احساس پیدا کرنے کے لیے اور خدا کی دنیا کو بدلنے کے لیے ایک زبردست قوّت کے طور پر کام میں نہیں لاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان اب تک اس دنیا میں مشرق کے زیرِ قیادت نوعِ بشر کی تکمیل کا وہ کردار ادا نہیں کر سکا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اقبال حلاج کی زبان سے ہمیں بتاتا ہے کہ اب مشرق میں ایک مردِ قلندر نے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے اور وہ خود اقبال ہے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو بیکار نہ کرے۔ خدا کے حضور میں محکم اور استوار رہے اور اس کے بحرِ نور میں ناپید نہ ہو جائے تاکہ دنیا میں خدا کی مرضی کو پورا کر سکے۔

بخود محکم گذر اندر حضورش　　　مشو ناپید اندر بحرِ نورش

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق　　　خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیش ایں نور ار بمانی استوار　　　حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

بے ذوقِ نمود زندگی، موت　　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اقبال نے سنائی اور رومی کی ایک گفتگو کے پیرایہ میں اپنے اس پیغام کی اہمیت کا خود ذکر کیا ہے۔ اس پیغام کا چرچا فردوس میں بھی ہے چنانچہ وہاں سنائی رومی سے کہتا ہے کہ مشرق میں ابھی تک تو وہی بیکار فلسفہ زندگی رائج ہے جو پہلے تھا لیکن حلاج (جس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تھا اور جو اس بنا پر خوب سمجھتا ہے کہ انا الحق کہنے کے معنی کیا ہیں) یہ روایت کرتا ہے کہ مشرق میں ایک مردِ قلندر نے خودی کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ تعمیرِ خودی میں خدائی ہے یعنی تعمیرِ خودی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کے اوصاف اور اخلاق اختیار کرتا ہے اور خدا ہی کی طرح دنیا کو بدلنا چاہتا ہے۔

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش!
حلاجؒ کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش!

خودی کا یہ احساس کہ وہ خدا ہے عارضی ہونے کے باوجود خودی کے اندر ایک عظیم الشان مستقل انقلاب پیدا کر جاتا ہے جس کے بعد خودی کے لیے ایک بالکل ہی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ خودی کے اس انقلاب کے مختلف پہلو حسبِ ذیل ہیں۔

غیر اللہ سے مکمل کنارہ کشی خودی کی قوّت کا راز

چونکہ خودی میں خدا کے سوائے اور کسی چیز کی خواہش باقی نہیں رہتی، خودی کا عمل غلط خواہشات اور تصوّرات کے اثر سے پوری طرح سے آزاد ہو جاتا ہے اور خودی خدا کی محبت کے لیے نہایت آسانی کے ساتھ ہر قسم کی تکلیفیں اٹھا سکتی ہے بلکہ اس قسم کی تکلیفوں کا کوئی احساس اس میں باقی نہیں رہتا۔ اقبال کی اصطلاح میں فقر خودی کی اس حالت کا نام ہے جب وہ غیر اللہ سے پوری طرح بے تعلق ہو کر خدا سے اپنا تعلق جوڑ لیتی ہے۔ جب تک خودی فقر کے اس مقام کو نہیں پاتی یعنی جب تک اس کی ساری محبت باطل تصوّرات سے (جن میں انسان کی اپنی سفلی خواہشیں اور الفتیں بھی شامل ہوتی ہیں) کٹ کر خدا کے لیے نہیں ہو جاتی، خودی خدا سے پورا قرب حاصل نہیں کر سکتی اور اس پر [illegible] کی وہ کیفیت وارد نہیں ہوتی جسے اقبال خودی میں ڈوبنے سے تعبیر کرتا ہے۔

اس کیفیت کا وارد ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اب خودی کی ساری محبت غیر اللہ سے کٹ کر کلیتاً اللہ کے لیے ہوگئی ہے۔ لہٰذا خودی جب اس حالت سے عود کرتی ہے تو اپنی محبت کا سارا خلوص اور اپنی ساری یک بینی، یک اندیشی اور یک باشی، جن کی وجہ سے وہ اس حالت تک پہنچتی ہے اپنے ساتھ لاتی ہے۔ پھر وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جو خدا نہ چاہتا ہو۔ اور بڑے سے بڑے خطرے کے باوجود کسی ایسے کام سے رک نہیں سکتی جو خدا چاہتا ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ دنیا کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے باطل کو فنا کرنے اور حکمِ حق کو جاری کرنے کے لیے کام میں لائے اور وہ اس غرض کے لیے ہر خطرہ کو مول لینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ شک اور خوف کی تمام قسمیں اس سے رخصت ہو جاتی ہیں اور وہ ایک بے پناہ قوتِ عمل کی مالک بن جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ وہ ایک تیز تلوار بن جاتی ہے جو باطل کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس تلوار کو تیز کرنے کے لیے لا الٰہ الا اللہ کا پختہ یقین یا فقر یا عشق اس سے پہلے فساں کا کام دے چکا ہوتا ہے۔ خودی کا سِرّ نہاں یہ ہے کہ وہ خدا سے محبت کرتی ہے اور خدا کے سوائے کسی اور محبوب کو قبول نہیں کرتی۔ خودی کی اصل حقیقت کیا ہے ؟ لا الٰہ الا اللہ یعنی خدا اور صرف خدا کی محبت کا ایک جذبہ۔ خودی ایک تلوار ہے، جو لا الٰہ الا اللہ کی فساں پر تیز کی جاتی ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ

تیغِ خودی کا کردار

جب خودی کی تلوار فقر کی سان پر تیز ہوتی ہے تو اس میں ایک زبردست قوت پیدا ہو جاتی ہے پھر ایک سپاہی کی ضرب بھی وہ کام کرتی ہے جو پوری فوج ہی سے بن آتا ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پر تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!

بعض لوگ لا الٰہ الا اللہ کو چند الفاظ سمجھتے ہیں لیکن خودی کے لیے اس کلمہ کی حیرت انگیز تاثیر کو دیکھا جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کلمہ الفاظ کا ایک مجموعہ نہیں بلکہ ایک شمشیر برہنہ ہے جو باطل کا قلع قمع کر دیتی ہے۔

ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست
لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

© rasailojaraid.com

جب خودی کے اندر ایسا انقلاب پیدا ہو جائے تو پھر یہ بات کوئی تعجب انگیز نہیں ہوتی بلکہ معمولی نظر آتی ہے کہ خودی اپنی قوتِ عمل سے باطل کو نیست و نابود کر کے حق پرستوں کی ایک نئی دنیا وجود میں لے آئے

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے

جس انسان کے اندر خودی کا یہ انقلاب پیدا ہوتا ہے وہ خدا کا عبد (یعنی عبدہٗ) بن جاتا ہے۔ عبدہٗ کائنات کی تخلیق کا مخفی راز ہے کیونکہ کائنات اسی کو وجود میں لانے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ لا الٰہ اگر تیغِ بے زنہار ہے تو عبدہٗ اس تلوار کی دھار ہے۔ عبدہٗ حاصلِ کائنات اور حاصلِ تخلیق ہے " مَارَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی " (جب تم نے اپنے ہاتھ سے ریت پھینکی تھی تو تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ خدا نے پھینکی تھی) کی آیت کریمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدہٗ خدا کا ہاتھ بلکہ خود خدا ہو جاتا ہے

لا الٰہ تیغ و دمِ اُو عبدہٗ فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
مدّعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت تا نہ بینی از مقامِ مَارَمَیْت

خودی کا یہ انقلاب مومن کو اپنی ترقی کے نقطۂ کمال پر اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ ماسوی اللہ کی محبت سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ خودی کا کمال خدا کی مخلصانہ محبت سے حاصل ہوتا ہے اور خدا کی مخلصانہ محبت خودی کے کمال سے۔ مومن کے یہ دونوں اوصاف درحقیقت ایک ہی وصف کے دو پہلو ہیں

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

دنیا کی ہر چیز سے کٹ جانا خدا کو پانے کی اور اپنے آپ کو پانے کی ابتدائی شرط ہے۔

تو ہم بذوقِ خودی رس کہ صاحبانِ طریق بریدہ از ہمہ عالم بخویش پیوستند

مقامِ فقر

توحید کامل کے اسی مقام کو اقبال فقر کا نام دیتا ہے کیونکہ اس مقام پر مومن فقط خدا کی رضا کا طالب ہوتا ہے اور دنیا سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن مومن کا فقر کافر کے فقر سے مختلف ہوتا ہے۔ کافر خدا کو چھوڑ کر [illegible] ہو جاتا ہے اور پھر دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، لیکن مومن دنیا کو

© rasailojaraid.com

صرف ایک مقصود اور محبوب کی حیثیت سے ترک کرتا ہے اور اسے خدا کی محبت کی تکمیل یعنی اپنے اصل محبوب اور مقصود کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ایک ذریعہ کے طور پر کام میں لاتا ہے پھر دنیا اس کی حاکم یا آقا نہیں رہتی، بلکہ محکوم یا غلام بن جاتی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اس کائنات کی ہر قسم کی مادی، سیاسی، اقتصادی، علمی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے قبضۂ قدرت میں لائے تاکہ ان کی مدد سے محبوب کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ آسانی کے ساتھ پورا کر سکے۔ اس طرح سے مومن کے ترک کا نتیجہ تسخیر اور تعمیرِ کائنات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری !!

مومن کے فقر کا اصل مقصد دنیا کو ترک کرنا نہیں بلکہ دنیا کو بزور بازو بدل کر درست کرنا ہوتا ہے، اسی لیے اقبال مومن کے فقر کو فقرِ غیور بھی کہتا ہے یعنی ایسا فقر جو باطل کو برداشت نہیں کرتا۔

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے 'فقرِ غیور' !

ترکِ جہان کا ذکر کرنے والوں کو معلوم نہیں کہ اسلام میں ترکِ جہاں کا مطلب تسخیرِ جہاں ہے۔

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو
ترکِ ایں دیرِ کہن تسخیرِ اُو

بعض غیر مسلموں کا یہ کہنا قرآن پر اتہام ہے کہ وہ ترکِ جہاں کی تعلیم دیتا ہے۔ کیا قرآن کی اسی تعلیم نے مومن کو دنیا کا حکمران اور مہ و پروین کو مومن کا غلام نہیں بنا دیا تھا؟

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

قرآن کا فقر

بعض لوگ چنگ و رباب کی موسیقی یا جنگ اور شراب کی مستی یا رقص اور سرود کی لذت کو فقر سمجھتے ہیں لیکن قرآن کا فقر یہ نہیں۔ قرآن جس فقر کی تعلیم دیتا ہے وہ ہر چیز کا محاسبہ کرتا ہے تاکہ یہ دیکھے

© rasailojaraid

کہ نیک کیا ہے اور بد کیا، زیبا کیا ہے اور زشت کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، کونسی چیز رکھنے کے قابل ہے اور کونسی فنا کرنے کے لائق۔ مومن کے فقر کا نتیجہ کائنات کی قوتوں کی تسخیر ہے۔ اس کے ذریعہ سے مومن خدا کی صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ کافر کا فقر یہ ہے کہ بدنی خواہشات کو ترک کر کے خدا کی جستجو کی جائے، مومن کا فقر یہ ہے کہ خودی کی تلوار کو لاالٰہ الااللہ کی فساں پر تیز کیا جائے۔ وہ خودی کا مارنا اور سوختہ کرنا ہے اور یہ خودی کو چراغ کی طرح روشن کرنا ہے۔ جب فقر آشکار ہوتا ہے تو چاند اور سورج بھی اس کے خوف سے لرزہ براندام ہوتے ہیں۔ بدر وحنین کے معرکے اور میدانِ کربلا میں حسینؓ کی تکبیر فقرِ آشکار کے مظاہر ہیں۔ جب سے فقر آشکارائی کے ذوق سے عاری ہوا ہے مسلمان قوم کا وہ جلال باقی نہیں رہا۔

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بُود — نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات — بندہ از تاثیرِ اُو مولا صفات
آں خدا را جستن از ترکِ بدن — ایں خودی را بر فسانِ حق زدن
آں خودی را کشتن و وا سوختن — ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر — از نہیبِ اُو بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین — فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسینؓ
فقر را تا ذوقِ عریانی نماند — آں جلال اندر مسلمانی نہ ماند

فقر کے معجزات

جب صاحبِ فقر مومن اپنے محبوب کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے میدانِ عمل میں آنے کا عزم کرتا ہے تو چونکہ وہ خدا کی مرضی کے عین مطابق اور کائنات کے ارتقاء کی سمت میں اور قولِ کُن کی مخفی قوتوں کو آشکار کرنے کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کو خدا کے ایک مخفی انتظام سے، اس کی پراسرار حکمت سے اور اس کے کام کو آسان بنانے کے لیے اس کے مناسب حال کچھ غیر معمولی قوتیں دی جاتی ہیں، جن کے اصل سبب کو عام لوگ نہیں جانتے، کیونکہ وہ دراصل فقر کی کرامات یا فقر کے معجزات کے طور پر ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی صاحبِ فقر مومن کو غیر معمولی علم دے دیا جاتا ہے کسی کو دن

© rasailojaraid
© rasailojaraid

کی حکمت سکھادی جاتی ہے، کسی کو غیر معمولی دانائی یا بصیرت عطا ہو جاتی ہے، کسی کو دلکش تقریر یا تحریر کا جوہر دے دیا جاتا ہے، کسی کو جاذبِ قلوب شعر کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، کسی کو قیادت اور لیڈرشپ کی غیر معمولی اہلیت دے دی جاتی ہے، کسی کے لیے لوگوں کے دلوں میں کشش پیدا کر کے مرجعِ خلائق بنا دیا جاتا ہے، کسی کو سپہ سالار بنا دیا جاتا ہے، کسی کو سلطنت، کسی کو اختیار و اقتدار اور کسی کو بادشاہت اور تخت و تاج کے انعامات دے دیئے جاتے ہیں۔ اقبال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

چونکہ فقر کے مقامات اور درجات ہزاروں ہیں، لہٰذا اس کے انعامات بھی ہزاروں ہیں۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ جس شخص کو ان نعمتوں میں سے کوئی مل جائے تو وہ اس کے مقامِ فقر کی دلیل یا علامت ہو گی۔ کیونکہ بعض وقت یہ نعمتیں ایسے انسانوں کو جو فقر کے مقام پر نہ ہوں، ان کی آزمائش کے لیے بھی دی جاتی ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ نعمت پانے والا خدا کا شکر بجا لاتا ہے یا نہیں۔

صبغۃ اللہ

جب خدا کا عاشق خودی میں ڈوب کر ابھرتا ہے تو اس کی خودی خدا کی صفاتِ حسن کے رنگ میں رنگی جاتی ہے جس طرح سے ایک سفید کپڑا جب کسی رنگ میں ڈبو دیا جاتا ہے تو اسی رنگ کو اختیار

© rasailojaraid
© rasailojaraid

کر لیتا ہے۔ پھر وہ خدا کے حسن سے ایک نیا حسن، خدا کے نور سے ایک نیا نور، خدا کے علم سے ایک نیا علم، خدا کی زندگی سے ایک نئی زندگی، اس کی قوت سے ایک نئی قوت اور اس کی محبت سے ایک نئی محبت لے کر آتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی خودی خدا کی صفات کو جذب کر کے خدا کے اخلاق سے متخلّق ہو جاتی ہے اور وہ خدا کے جمال کا ایک عکس بن جاتا ہے۔ اس کے نیک و بد، زشت و زیبا، خوب و ناخوب اور محمود و نامحمود کے امتیاز کا معیار وہی ہو جاتا ہے جو خدا کا ہے۔ اس کا عدل وہ معمولی عام آدمیوں کا عدل نہیں رہتا جو ہمیشہ ان کی اپنی سفلی اغراض سے ملوّث اور ناقص تصوّرات کی ناپاک محبت سے آلودہ ہوتا ہے، بلکہ اس کا عدل وہ اعلیٰ درجہ کا خالص اور صحیح عدل ہوتا ہے جو صرف خدا کی محبت کے منبع سے صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اس کا صدق، اس کا کرم، اس کی حیا، اس کی عفت اور پاکیزگی، اس کا رحم اور اس کی تمام اخلاقی صفات چونکہ خدا کی کامل اور خالص محبت سے سرزد ہوتی ہیں، بلند ترین درجہ کی ہوتی ہیں۔

رنگ او بر کن مثالِ او شوی
در جہاں عکسِ جمالِ او شوی

یہی خدا کا وہ رنگ ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ہے کہ خدا کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہے؟ اور یہ رنگ انسان کو خدا کی عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ البقرۃ: ۱۳۸)

ہر اخلاقی قدر اتنی ہی قسموں یا درجوں کی ہوتی ہے جتنے انسانوں کے تصوّراتِ حسن یا نظریاتِ زندگی ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کا تصوّرِ حسن پست ہو گا تو اس کا عدل یا صدق بھی اسی نسبت سے پست درجہ کا ہو گا۔ سچّا عدل یا سچّا صدق صرف خدا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور ایک خداشناس مومن ہی کا حصّہ ہوتا ہے۔ خودی پر خدا کا رنگ خدا کی گہری اور مخلصانہ عبادت اور محبت سے چڑھتا ہے۔ اس محبت کی وجہ سے خودی خدا کی صفات کے حسن کو جذب کرتی ہے اور ہوس کے بتوں کو توڑ کر تمام رذائل سے پاک اور تمام فضائل سے آراستہ ہو جاتی ہے۔

محکم از حق شو، سوئے خود گام زن
لات و عزّائے ہوس را سر شکن

© rasailojaraid
© rasailojaraid
© rasailojaraid

خدا کی عبادت اور محبت سے انسان کی خودی خدا کی صفات کو کس طرح سے جذب کر لیتی ہے اور کس طرح سے متخلق باخلاق اللہ ہو جاتی ہے۔ اقبال ہمیں بتاتا ہے کہ جذب کرنا زندگی کا خاصّہ ہے۔ اگر زندگی حیاتیاتی سطح پر غذا سے اپنی ضرورت کے مادی ذرات کو جذب کر کے نشوونما پاتی ہے تو نفسیاتی یا نظریاتی سطح پر صفاتِ حسن کو جذب کر کے نشوونما پاتی ہے۔ حسن خودی سے وہی نسبت رکھتا ہے جو غذا جسم سے رکھتی ہے۔ جاوید نامہ میں جہاں دوست نے جو کام کی نو باتیں کہی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس نے گلاب کے پھول سے پوچھا کہ تم باد و خاک سے یہ خوشنما رنگ اور یہ دلنواز خوشبو کیسے حاصل کرتے ہو، تو گلاب کے پھول نے جواب دیا کہ تم بجلی کی رو سے جو خاموش ہوتی ہے کسی کا پیغام کیسے سن لیتے ہو جس طرح تم برق سے پیغام حاصل کر لیتے ہو جس میں بظاہر کلام کا وصف نہیں، میں باد و خاک سے جن میں رنگ و بو نہیں رنگ و بو حاصل کر لیتا ہوں۔ دونوں کا انحصار زندگی کی اس خاصیت پر ہے کہ وہ اپنی فطرت سے مناسبت رکھنے والی چیزوں کو جہاں سے ملیں قابل جذب کر لیتی ہے۔ اگر زندگی کے اندر یہ خاصیت نہ ہوتی تو وہ اپنے آپ کو قائم نہ رکھ سکتی۔ انسان کا جذب ظاہر ہے کیونکہ وہ حسن سے حسن کو جذب کرتا ہے لیکن میرا جذب ظاہر نہیں کیونکہ میں بظاہر غیر حسین سے حسن کو جذب کرتا ہوں۔

من بگل گفتم بگو اے سینہ چاک! چوں بگیری رنگ و بو از باد و خاک ؟
گفت گل اے ہوشمندِ رفتہ ہوش چوں پیامے گیری از برقِ خموش
جاں بتن مارا ز جذبِ این و آں جذبِ تو پیدا و جذبِ ما نہاں!

خودی غیر محدود اور غیر فانی ہے

چونکہ انسان کی خودی خدا کے ساتھ پیوست ہو کر خدا کی صفات سے حصہ لیتی ہے وہ اپنی بالقوہ صلاحیتوں کے اعتبار سے خدا کی طرح غیر محدود ہے۔ اگرچہ وہ ایک چھوٹی سی آب جو نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!

خودی اپنی ممکنات کے اعتبار سے محیط بیکراں اس لیے ہے کہ وہ ہمہ تن خدا کی آرزو ہے

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

اور خدا غیر محدود اور بیکراں ہے۔ چونکہ خدا غیر محدود ہے ضروری ہے کہ غیر محدود ہونے کی آرزو خدا کی آرزو کے اندر موجود ہو۔ غیر محدود خدا کے لیے خودی کی آرزو اس بات کا ثبوت ہے کہ خودی کو غیر محدود ہونے کی آرزو بھی ہے۔ اقبال اس آرزو کی ترجمانی کرتا ہے۔

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو ۔۔۔ یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر!

اور پھر یہ آرزو ایسی ہے جو تشفی پانے کے لیے پیدا کی گئی ہے کیونکہ اس کے تشفی پانے سے ہی کائنات اپنی تکمیل کے مرحلے طے کر سکتی ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی ضمانت ہے کہ خودی بے کنار ہو کر رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی اپنی فطرت، اپنی ممکنات اور اپنی بالقوہ صلاحیتوں کی وجہ سے بے کنار ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کے شعر میں ہمکنار ہونے کی آرزو بھی درحقیقت بے کنار ہونے کی ہی آرزو ہے۔ پھر چونکہ خودی خدا کی صفات سے حصہ لیتی ہے وہ اپنی ممکنات کے اعتبار سے غیر محدود ہی نہیں بلکہ غیر فانی بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابدیت بھی خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ زاہد کا یہ مقولہ کہ "خودی فانی ہے" اس بات کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ خودی غیر محدود ہے اگرچہ وہ بظاہر ایک حباب کی طرح محدود نظر آتی ہے لیکن اس حباب میں ایک دریائے ناپیدا کنار چھپا ہوا ہے۔ اگر خودی اس بنا پر غیر محدود ہے کہ وہ خدا کی صفات سے حصہ لیتی ہے تو اس بنا پر غیر فانی کیوں نہیں ہو سکتی۔ اگر زاہد ظاہر بین کو خودی کا غیر محدود ہونا سامنے نظر آ رہا ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ کیوں نہیں نکالتا کہ وہ غیر فانی بھی ہے۔

اے زاہد ظاہر بیں، گیرم کہ خودی فانی است
آیا تو نمی بینی دریا بحباب اندر!

دل کی شہادت

چونکہ اس مقام پر مومن خدا کی ذات کو بے پردہ دیکھ لیتا ہے اور اس کی آرزوئے حسن جو اسے بے قرار رکھتی تھی پوری طرح سے تشفی حاصل کر لیتی ہے، یعنی اتنی تشفی جتنی کہ اس کی خودی کی استعداد کے پیشِ نظر اس دنیا میں ممکن ہوتی ہے لہٰذا وہ خدا کی ہستی کا جسے وہ پہلے اعتقادی طور پر اور بعد میں عملی طور پر مانتا تھا، اب ذاتی گواہ بن جاتا ہے اور اس کے دل کو ایک مکمل اور مستقل اطمینان نصیب ہوتا ہے،

© rasailojaraid.com

کیونکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے کائنات کا راز اور انسانی زندگی کا مدّعا معلوم کر لیا ہے۔ اب خبر نہیں بلکہ نظر یعنی ذاتی مشاہدہ اس کے یقین و ایمان کا سامان بنتی ہے۔ اس حالت سے پہلے وہ "لا الٰہ الا اللہ" کہتا ہے تو عربی زبان کو جاننے کے باوجود اس طرح سے جیسے کوئی شخص کسی اجنبی زبان کے الفاظ کو مطلب سمجھنے کے بغیر دہرا رہا ہو لیکن قلب کی اس شہادت اور دل کی اس تصدیق کے بعد وہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی کی تہ تک پہنچ جاتا ہے اور اصل بات یہ ہے کہ جب تک دل گواہی نہ دے کلمۂ توحید کا مطلب پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لَا اِلٰہَ اِلَّا !
لغتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی !

لیکن دل کی گواہی یا تصدیق کی نعمت انسان کو خدا کی محبت کی انتہائی منزل پر ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ یہی دل کی گواہی یا تصدیق خودی کے زندہ ہونے کی شرط ہے۔

لاالٰہ گوئی بگو از روئے جان !
تا ز اندام تو آید بوئے جان !

عشق اور عمل سے خودی کا استحکام

اگر مومن کا نمایاں وصف علم ہو تو خودی کے انقلاب اور استحکام کے بعد اس کا علم کمال پر پہنچ جاتا ہے اور انسان اور کائنات کے اسرار و رموز اس پر اس طرح سے آشکار ہوتے ہیں کہ گویا جبریل بھی اس کے علم پر رشک کرنے لگتا ہے۔ اور اگر مومن کا نمایاں وصف عاشقانہ عمل ہو تو خودی کے انقلاب اور استحکام کے بعد اس کا عشق محرکِ عمل کی حیثیت سے کمال پر پہنچ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی قوت سے ایک قیامت برپا کر دیتا ہے۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
خودی ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل !

اس حالتِ کمال کو پانے کے بعد جب وہ قرآن پڑھتا ہے تو اس کی آیات کے مطالب اور معانی کو اور طرح سے سمجھتا ہے کیونکہ پھر اسے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ معانی اور مطالب خود اس کے

© rasailojaraid.

دل کے اندر پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایسے ہی مومن کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو پالیتا ہے تو اسے ایک علم حاصل ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن کی آیات بیّنات پہلے ہی اس کے دل کے اندر موجود تھیں:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (العنکبوت: ۴۹)

بلکہ قرآن ایسی آیاتِ بیّنات پر مشتمل ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم دیا جاتا ہے پہلے ہی سے موجود ہیں۔

گویا وہ محسوس کرتا ہے کہ قرآن خود اس کے ضمیر پر نازل ہوا ہے۔ اور جب یہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے تو آیاتِ قرآنی کے معانی اور مطالب کی گرہیں اس پر کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اور جب تک یہ صورتِ حال پیدا نہ ہو رازی اور صاحبِ کشاف بھی اس کے لیے یہ گرہیں کھول نہیں سکتے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشّاف

جب تک کہ وہ اس حالت کو نہیں پہنچتا یعنی ان معنوں میں خود صاحبِ قرآن نہیں بن جاتا، وہ بار بار قرآن کی تلاوت کرنے کے باوجود قرآن کے مطالب پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ قرآن پڑھنے میں ہی لگا رہتا ہے اور قرآن پر عمل کر کے خدا کی دنیا کو بدلنے کا وقت اس پر نہیں آتا۔

نہیں کتاب سے ممکن تجھے فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں!

لیکن جب وہ اس حالتِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اپنے ضمیر کی روشنی دین کے اسرار و رموز اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس کے بغیر وہ کسی اور طریق سے ان اسرار و رموز کو کبھی جان نہیں سکتا۔ جب تک وہ اس حالت کو نہ پہنچے وہ دین پر مجبوری سے عمل کرتا ہے، رغبت سے عمل نہیں کرتا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے احکام کی تعمیل مجبوری سے کرتا ہے وہ اس شخص کی نسبت خدا سے بہت دور ہے جو رغبت اور محبت سے ان کی تعمیل کرتا ہے۔

فاش سے خواہی اگر اسرارِ دیں
جز با عماقِ ضمیرِ خود مبیں!
گر نہ بینی دین تو مجبوری است
ایں چنیں دیں از خدا مہجوری است

© rasailojaraid.

گویا ایسی حالت میں مومن فقط قاری نہیں رہتا بلکہ خود قرآن بن جاتا ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!

علم عشق سے راہ نمائی پاتا ہے

پھر جب وہ انسانوں کے پیدا کیے ہوئے علوم پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ کسی فلسفی یا حکیم، سائنسدان یا عالم دین، مفتی یا مجتہد، اور مفسر یا فقیہہ کی کون سی بات درست ہے اور کون سی غلط۔ اس کا علم خود اس کو بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے علم نے جو خدا کی محبت کے کمال سے محروم ہیں جو غلط حقائق کے بت کھڑے کر لیے ہیں ان کو کس طرح سے توڑا جا سکتا ہے اور ان کی بجائے صحیح حقائق کو کس طرح سے اٹھایا جا سکتا ہے۔

© rasailojaraid.

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

عالم دین یا فقیہہ منطق کی نازک خیالیوں یا لغت کی موشگافیوں سے اپنی علمی مشکلات کو حل کرنا چاہتا ہے اور پھر بھی حل نہیں کر سکتا۔ لیکن ایسا مومن کلمۂ توحید کے نورِ تجسّس کی مدد سے ہر علمی حقیقت کو بآسانی دیکھ لیتا ہے، کیونکہ وہ اس کے دل میں پہلے ہی موجود ہوتی ہے اور اسے دیکھنے کے لیے اسے فقط اپنے دل میں جھانکنا پڑتا ہے اور اسے منطق اور لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

قلندر جز دو حرفِ لآ اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

خودی کے اسی مقام کو اقبال 'تجلّی' (یعنی خدا کے نور کا چمکنا) کہتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ 'تجلّی' کے بغیر انسان بے یقینی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے اپنے شکوک و شبہات ہی اس کی روحانی موت کا موجب بن جاتے ہیں۔ گویا مقامِ تجلی انسان کے شکوک و شبہات کو دُور کر کے اس کے یقین کو محکم کرتا ہے اور اس کی عقل اور اس کے دین کی صحیح راہ نمائی کرتا ہے۔ تجلی کے بعد انسان کی عقل اسے خدا کے اور قریب لاتی ہے، اس سے دُور نہیں کرتی اور وہ احکامِ دین کی پابندی کسی

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

© rasailojaraid.